حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہیدؒ

ایک شخص... ایک انجمن

محمد یاسر عبداللہ، متعلم تخصصِ فقہِ اسلامی

ہمارے شیخ رحمہ اللہ کی شخصیت اس قدر پرکشش تھی کہ جو ایک بار ملتا آپ کے اخلاق وعادات سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہتا، ہر ایک کا یہ خیال تھا کہ ان کا سب سے زیادہ مجھ سے تعلق ہے اور یوں اس سنت پر ان کا غیر اختیاری عمل تھا۔ برادرم مولانا فصیح الرحمٰن کے بقول: شہادت کے بعد جامعہ میں صفائی پر مأمور ایک غیر مسلم تعزیت کے لئے آیا، اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا کہ: مجھ سے وہ تعلق رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً چپکے سے مالی تعاون کیا کرتے تھے۔

جامعہ کے ایک ادنیٰ خادم کے ساتھ جب آپ کا یہ معاملہ تھا تو اساتذہ وطلبہ کے ساتھ تعلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بندہ نے خود عوام الناس میں سے کئی لوگوں کو یہ اظہار کرتے سنا کہ: مولانا ہمارا بڑا خیال رکھتے تھے، کبھی کبھار فون کرکے حال احوال دریافت کرتے، پریشانی اور مسائل سنتے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے تھے، ہماری خوشی غمی میں شریک ہوتے اور ہمیں اپنائیت کا احساس دلاتے تھے۔ طرزِ زندگی میں وضع داری اور احباب ومتعلقین کے لئے طرح داری حضرت استاذ جی کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اپنی بے انتہا مصروفیت اور بے شمار مشاغل کے باوجود تعلق داری کا یہ وصف یقیناً ان کی کھلی کرامت تھی۔ میرے محسن ومربی حضرت شیخ عطاء رحمہ اللہ کا ایک نمایاں وصف ''اکابر پر اعتماد'' تھا، آج کا زمانہ فتنوں کا زمانہ ہے، جس میں علمی اور فکری تحریکوں کا ایک طوفان برپا ہے، قلم وقرطاس کے عموم وشیوع کے متعلق لسانِ نبوت کی بیان کردہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوتے دکھائی دے رہی ہے۔ منفرد اسلوب اور پُرفریب طرزِ تحریر کے ساتھ ''تحقیق کے نام پر تشکیک'' کا زہر گھول کر پلانے والے دانشوروں کی ایک کھیپ اُمنڈتی چلی آرہی ہے، جو پچھلوں کی تحقیقات پر خطِ نسخ پھیر کر اپنی آراء کو نصوص کا درجہ دینے پر مصر ہیں اور آزادیِ اظہارِ رائے کے دلرُبا نعرے کے ذریعہ مسلمات ومجمع علیہا مسائل کو بھی ازسرِ نو غور وفکر اور ''اجتہاد'' کے لائق قرار دے رہے ہیں۔ حضرت استاذِ محترم نہایت ذکی الحس اور بالغ النظر عالم تھے، گرد وپیش کے احوال، اٹھتی ہوئی تحریکوں اور نت نئی تحقیقات پر ان کی گہری نظر تھی، اس لئے وہ خود بھی اپنے آپ کو اکابر کے دامن کے ساتھ باندھے ہوئے تھے اور طلبہ کو بھی اسی کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اپنے درس وبیانات میں اکثر اکابر کے اقوال سناتے اور ان

کی عظمت دلوں میں بٹھاتے۔ایک بار فرمانے لگے کہ: ''میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ انہی اساتذہ سے پڑھ کر جاتے ہیں اور پھر اُنہی کو بُرا بھلا کہتے ہیں''۔اکابر کے مسلک ومنہج اور ان کی علمی تحقیقات پر استاذ جی کو کلی اعتماد تھا، اس سلسلے میں وہ ''متعصب'' تو نہیں تھے، لیکن ''متصلّب'' ضرور تھے۔

ہمارے شیخ رحمہ اللہ (جن کو طلبۂ بابوزئی مردان اور اہل خانہ محبت سے ''لالہ جی'' کہا کرتے تھے) میں عشقِ رسالت کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا، دورہ حدیث کے سال صحیح مسلم (جلدِ ثانی) کے درس اور دیگر مواقع میں ذکرِ رسالت (علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات) پر ان کی ضبط کرتی آنکھیں اس وقت بھی نگاہوں میں گھوم رہی ہیں، اگر چہ اپنی قلبی کیفیات کے اخفاً کی حد درجہ کوشش فرماتے تھے، لیکن عشق کی خوشبو بھی بھلا پھوٹے بغیر رہتی ہے؟ دلی کیفیت سے قریب بیٹھنے والا ضرور متأثر ہوتا ہے، اپنے لطیف انداز میں رومال سے آنسوؤں کو تو وہ پونچھ لیتے تھے، لیکن متأثر ہوتے قلوب کو روکنا ان کے اختیار میں نہ تھا، چنانچہ بارگاہِ رسالت سے اس تعلق کا اظہار وقتاً فوقتاً نعتیہ اشعار کی صورت میں ہوتا رہتا تھا، بارہا ان سے یہ شعر سنا جو آج بھی ان کے لہجہ کی گھن گرج کے ساتھ کانوں میں گونج رہا ہے:

سنا ہے قبر میں دکھلاتے ہیں شبیہِ نبی
اجل کا اس لئے ہم انتظار کرتے ہیں

آج یقیناً ان کی یہ خواہش پوری ہو چکی ہوگی۔قدرت نے اُنہیں آواز بھی خوبصورت دے رکھی تھی، جب کبھی اپنی لَے میں ترنم کے ساتھ اشعار سناتے تو اِک سماں سا بندھ جاتا تھا اور سامعین بھی اپنے سینوں میں عشق کی چنگاری سلگتی محسوس کرتے تھے اور یہی جذبۂ محبت تھا جو انہیں ہر سال کشاں کشاں حرمین شریفین (زادھما اللّٰہ شرفاً) کی طرف کھینچ لے جاتا، جہاں وہ اپنی پیاس بجھاتے اور قلبی تسکین کا سامان حاصل کرتے۔سفرِ حرمین کو اپنی اخفاً پسند طبیعت کے موافق حتی الامکان مخفی رکھتے تھے، بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ جامعہ کے اساتذہ کو بھی ان کے حرمین جانے کے بعد سفر کا علم ہوا، دیارِ محبوب کی طرف روانگی کے وقت ان کی کیفیت دیدنی ہوتی تھی، شنیدنی نہیں۔

شعروشاعری کی بات چھڑی ہے تو آپ کے ادبی ذوق کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا، فرمانِ رسالت کے بموجب ''بعض اشعار پُرحکمت ہوتے ہیں'' اور حدود وآداب کی رعایت کے ساتھ ادبی ذوق نعمتِ خداوندی ہے، ہمارے شیخ عطاء رحمہ اللہ پاکیزہ ادبی وشعری ذوق رکھتے تھے، بلا مبالغہ اردو، عربی، فارسی اور پشتو کے ہزاروں اشعار ان کے حافظہ میں محفوظ تھے، موقع کی مناسبت سے اشعار کا برمحل استعمال ان کی گفتگو اور بیانات کو چار چاند لگا دیتا تھا، آج بھی ان کی مترنم آواز میں سنے ہوئے بے شمار اشعار ہیں جو کانوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ان کا ادبی ذوق صرف شعر سننے سنانے تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ گہرے ادب شناس تھے، ایک بار اردو کے کسی لفظ پر بحث چھڑی تو اپنی رائے کی تائید میں کئی الفاظ پیش کر دیئے جو زبان پر ان کی گرفت کی واضح دلیل ہے۔

عربی ادب میں بھی ان کا اپنا مقام تھا، مختلف لہجوں میں بے تکلف گفتگو پر قادر تھے، درسِ حدیث

کے دوران کبھی حدیثِ مبارک میں کوئی غریب لفظ آجاتا تو برجستہ شعر پڑھ کر استشہاد فرماتے، ہمارے درسِ نظامی میں شامل کتب مقاماتِ حریری، دیوانِ متنبّی اور حماسہ کے بے شمار اشعار نوک برزبان تھے۔ اپنے اس ذوق کے باجود وہ جادۂ اعتدال پر قائم تھے، بعض لوگوں پر ادبی ذوق اتنا غالب ہوجاتا ہے کہ قرآن وحدیث میں انہیں وہ لطف نہیں آتا جو شعروشاعری میں محسوس ہوتا ہے، حضرت استاذِ محترم اس چیز کو قطعاً ناپسند فرماتے تھے، ایک بار ایک فاضل شاگرد نے عرض کیا کہ: استاذ جی! مجھے آپ سے اشعار سن کر یاد کرنے کا شوق پیدا ہوا، حضرت الاستاذ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''مجھ سے تم نے یہی سیکھا؟ یہ کوئی سیکھنے کی چیز ہے؟''۔ گویا تنبیہ تھی کہ ہر چیز کو اس کا مقام دینا چاہئے، یہ ان کی طبیعت کی اعتدال پسندی کا نتیجہ اور طلبہ کی تربیت کے خاص ذوق کا ایک نمونہ تھا۔

طلبہ کی تربیت کے معاملہ میں ان کا اپنا انداز تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ''استوصوا بهم خيراً'' پر وہ پوری طرح عامل تھے، البتہ جس چیز کو ان کے لئے خیر کا باعث سمجھتے اس کو اختیار فرماتے، ہم طلبہ کی جماعت اپنی کوتاہ فہمی اور کم علمی ولا اُبالی پن کی بنا پر نہ جانے کن کن چیزوں میں اپنا وقت برباد اور علمی وفکری صلاحیتوں کا ضیاع کرتے ہیں، ہمارے شیخ رحمہ اللہ اس سلسلہ میں بے حد حساس مزاج رکھتے تھے، طلبہ کی حرکات وسکنات، وضع قطع اور دیگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگاہ رکھتے اور موقع بموقع تنبیہ واصلاح فرماتے تھے، اکثر فرماتے تھے کہ: ''اولاد اور طلبہ کی محبت صرف دل میں ہونی چاہئے، اس کا اظہار ان کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے'' چنانچہ اپنی اولاد کی تربیت کے معاملہ میں بھی ان کا منفرد انداز تھا، جس کے اثرات ان کی اولاد پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں اور استاذِ محترم حضرت مولانا عبدالرؤف غزنوی دامت برکاتہم نے بھی شہادت کی رات تعزیتی مجلس کے دوران اس کا خصوصی ذکر فرمایا تھا۔ اپنے سرانجام دیئے ہوئے کارناموں کے متعلق حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا حال یہ تھا کہ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پرواہ، بڑی سے بڑی خدمات پر بھی اپنا نام نہ آنے دیتے تھے، بلکہ دیگر رفقا کی طرف منسوب کردیتے تھے، آج ملک بھر میں سینکڑوں جگہوں پر اسکول وکالج کے طلبہ کے لئے شروع کیا گیا ''چالیس روزہ دینی واخلاقی تربیتی کورس'' دن دوگنی رات چوگنی ترقی کررہا ہے، درحقیقت یہ سلسلہ ہمارے شیخ عطاء رحمہ اللہ ہی کی فکر کا نتیجہ تھا، اپنی مسجد (مسجد صالح صدر جہاں امام وخطیب تھے) سے اس کا آغاز کیا، کورس کی کتابیں مرتب کروائیں اور کورس کے دنوں میں جگہ جگہ جاکر جائزہ لیتے، مفید مشوروں سے نوازتے، حوصلہ افزائی کرتے اور کوتاہیوں کی نشاندہی فرماتے، ہر سال جون جولائی کی تعطیلات شروع ہونے سے قبل مختلف مقامات پر کورس کا انعقاد کرنے والے منتظمین واساتذہ کو جامعہ میں جمع کرکے کورس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے، تدریس کا اسلوب اور دیگر مفید باتیں بتلاتے، یہ ایک پُرکیف مجلس ہوتی تھی، امسال بھی یہ مجلس ۱۹ مئی بروزِ اتوار کو الحمد للہ! اسی جوش وخروش کے ساتھ منعقد ہوئی، بس نگاہیں حضرت استاذ محترم کی متلاشی رہیں اور دل ان کی کمی کو محسوس کرتا رہا:

بہت لگتا تھا جی ان کی محفل میں
وہ اپنی ذات میں اِک انجمن تھے

اس کورس پر اس قدر محنت و جد و جہد کے باجود اپنا نام خود لینا تو درکنار کسی سے سننا بھی گوارا نہ تھا، اس کو بانی جامعہ محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ و دیگر اکابرِ جامعہ کی فکر کا نتیجہ قرار دیتے اور کورس کا نصاب کتابی صورت میں مرتب کروا کر جامعہ ہی کے لئے وقف کر دیا۔

لیکن اخفاً وخمول کا یہ معاملہ محض اپنی ذات کے ساتھ مخصوص تھا، اپنے پہاڑوں جیسے کاموں کو ذرّہ نہ سمجھتے، لیکن دوسروں کے ذرہ کو بھی پہاڑ کا درجہ دے کر خوب حوصلہ افزائی اور تشجیع فرماتے، اصاغر نوازی بھی ان کا امتیازی وصف تھا، بندہ تا حیات یہ بات نہیں بھول سکتا کہ دورہ حدیث کے سال حضرت استاذِ محترم نے اپنے درسِ صحیح مسلم میں عبارت خوانی کے لئے بندہ کو منتخب فرمایا اور میری بے حد تشجیع فرمائی، ان کے اس عمل نے مجھے کس قدر حوصلہ اور جرأت دی اور آگے بڑھنے کی تحریک پیدا کی، یہ میں اور میرا رب جانتا ہے، نہ جانے کتنی چھپی صلاحیتوں کو مہمیز دے کر نمایاں کیا ہوگا؟ پھر انہوں نے عملی میدان میں آگے بڑھ کر کیا کچھ کارنامے انجام دیئے ہوں گے؟ یہ سب ہمارے استاذ محترم رحمہ اللہ کے نامۂ اعمال کا حصہ ہے، جس کا صلہ رب انہیں ضرور دے گا، ان شاء اللہ!

صالح مسجد (صدر) جہاں آپ امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، شہر کی مرکزی مساجد میں شمار ہوتی ہے، اس مسجد کی اہمیت کی بنا پر وہ بجا طور پر اس کا حق ادا فرماتے تھے، یہیں سے ۱۹۹۸ء میں ''چالیس روزہ کورس'' کا آغاز کیا جو بعد میں موجودہ شکل تک پہنچا، مسجد کے نمازی بھی آپ سے محبت کرتے تھے، بہت سے لوگ آپ کی اقتدأ میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لئے دور دور سے آتے تھے، ہمارے تخصص کے ایک ساتھی کے قریبی عزیز ہر جمعہ کو صرف استاذِ محترم کا بیان سننے اور آپ کی اقتدأ میں نمازِ جمعہ پڑھنے کے لئے حیدرآباد سے سفر کر کے آتے تھے، جمعہ کی نماز کے لئے مسجد کھچا کھچ بھر جاتی، اور نمازیوں کی کثرت کی بنا پر متصل جہانگیر پارک میں بھی ٹینٹ لگا کر صفیں بچھائی جاتی تھیں، اگرچہ وہ معروف معنوں میں جلسے جلوسوں کو گرمانے والے خطیب نہیں تھے، لیکن ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق ان کی دل سے نکلی ہوئی باتیں دلوں پر اثر کرتی تھیں اور عوام الناس اپنی زندگیاں بدلتے تھے۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے کمرے میں ان کی یادگاروں کو دیکھ کر بھی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں، سچ یہ ہے کہ:

جہانے را دِگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

آپ کے فیض یافتہ نمازی، دیگر لوگ اور آپ کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں شاگرد، آپ کی نیک صالح اولاد، آپ کا جاری کردہ کورس اور نہ جانے کیا کچھ آپ کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں۔